(قسط ۳)

دو مذہبی نظام ہائے فکر

تقلیدی اور تخلیقی

الطاف جاوید

عام طور پر مذہب کے بارے میں دو نظام ہائے فکر ہوتے ہیں۔ ایک تخلیقی اور دوسرا تقلیدی۔ تاریخ اسلام کے عہد اقبال میں ہمارے ہاں تخلیقی نظام فکر کو اولیت حاصل تھی۔ اور اب بدقسمتی سے تقلیدی مذہبی نظام فکر غالب ہے۔ اس سے ہمارے ہاں کیا خرابیاں اُبھریں، اور انہوں نے ہماری کیا حالت کر دی پچھلی دو قسطوں میں اس کا بیان ہے۔ (مدیر)

مذہبی تقلیدی نظام نے دین اور دنیا کی اصطلاحوں پر زور دے کر حیاتِ انسانی کے ارتقائی عمل میں زبردست رکاوٹ پیدا کر دی ہے جس سے انسانی ترقی کئی ہزار برس کے لئے التوا میں پڑ گئی ہے۔

دین و دنیا کے بعد دوسری تقسیم کی وضاحت علمِ الٰہی اور علم انسانی کی اصطلاحوں میں کی گئی ہے، مذہبی تقلیدی نظام نے شروع ہی سے علم کو علم بالحواس اور علم بالوجدان کے دو مستقل خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جس میں سے علم بالحواس کو دنیوی یا غیر دینی اور علم بالوجدان کو جس کی سب سے اعلیٰ شکل علم بالوحی ہے، علم الٰہی قرار دے رکھا ہے۔

قرآنِ حکیم نے حصولِ علم کے ذرائع، سمع، بصر اور فواد کو قرار دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے سمع سے تاریخ، بصر سے تجربہ یعنی سائنس اور فواد سے وجدان مُراد لیا ہے۔ تاریخ کے ذریعہ ہم سماج اور اُس کے اداروں کے فطری ارتقاء، اُن کی بدلتی ہوئی شکلوں اور حیثیتوں اور اُن کی تاریخی غایت کو معلوم کرتے ہیں۔ اور یہی عمرانی سائنسوں کا موضوع بھی ہے۔

فطرت کے مظاہر سے ہم طبیعی سائنس کی بنیادوں کو اُستوار کرتے ہیں اور تحقیق کے استقرائی منہاج

کی مدد سے طبیعی اور عمرانی سائنسوں کی تدوین کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ علوم مشاہدہ، تجربہ اور بازپیدائش کے عمل (پراسس) سے گزرتے ہیں، اس لئے اِن سے حاصل کردہ علم علم حقیقی شمار ہوتا ہے۔ اور حقیقی ہونے کی حیثیت سے یہ علمِ الٰہی کا حصہ متصور ہوتا ہے۔ وجدان کے ذریعہ ہم وجود کے حیاتیاتی اور فطری مظاہر کے مبدا رومعاد اور اُن کی غایتِ تخلیق کے متعلق اُن مذہبی حقائق اور اقدار کے ثبوت کے لئے بازتجربہ کرتے ہیں جنہیں وحی الٰہی نبی کے قلبِ مطہر پر نازل کرتی ہے۔

علاّمہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں وجدانی تجربات اور علم بالحواس کے تجربات کو مساوی قرار دیا ہے۔ دونوں کے احساسات و مدرکات پر تنقید کے ذریعہ اُن میں شامل شدہ حق اور باطل کو الگ الگ کیا جاسکتا ہے۔ اور اس تجزیاتی "تنقیدی" پراسس سے فطرت، سماج اور نفسِ انسانی کے متعلق خالص علم یا سائنٹفک حقیقت کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وحی الٰہی جن حقائق کو بیان کرتی ہے اور سائنسی "پراسس" جن قوتوں اور قوانین کو منکشف کرتا ہے۔ یہ دونوں ماورائے ادراک نہیں ہیں۔ بلکہ انسانی شعور کی گرفت میں آسکتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں شعور کی گرفت میں لانے کے لئے ایک ہی طرح کے "پراسس" سے گزرنا ہوتا ہے اور یہ پراسس تجزیاتی، تجرباتی اور تنقیدی ہوتا ہے۔ اپنی اس کوشش میں درحقیقت علامہ اقبالؒ نے علم بالحواس اور علم بالوحی کے درمیان حائل شدہ خلیج کو پاٹ دیا ہے۔ اِن دونوں علوم کو ثنوی حیثیت دینے کی بجائے اُنہیں ایک وحدت میں سمو دیا ہے۔

اِن علوم کی ثنوی تقسیم نے انسانی ذہن اور عمل کو سخت اُلجھاؤ میں مبتلا کر دیا ہے۔ انسان نے فطرت اور معاشرہ کے متعلق جن علوم کو آج تک منکشف کیا ہے، اُن سب کو انسانی علم کے ضمن میں شمار کر کے دنیا کی طرح ناپاک اور غلطیوں سے معمور اور ظنی قرار دے دیا گیا ہے۔

سرسیدؒ کا دَور

سرسید اور اُن کے رفقاء کے عہد میں اِن دونوں علوم کے متعلق جب بحث نے سر اُٹھایا تو سرسید نے اس کے جواب میں بتایا تھا کہ کائنات خدا کا عمل ہے اور قرآنِ حکیم خدا کے الفاظ ہیں۔ اس لئے یہ بات محال ہے کہ خدا کے عمل اور علم میں تضاد یا دُوئی پائی جائے۔ لہٰذا کائنات کے مطالعہ سے سائنس جن حقائق کو دریافت کر رہی ہے، اُن میں اور قرآنی مطالب میں تضاد کا پایا جانا ناممکن ہے۔

یہ جواب اُس عہد کی عقلیت کے مطابق صحیح تھا۔ کیوں کہ اُس عہد میں فطرت کے کیمیادی اعمال کا زیادہ عمیق مشاھدہ اور مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔ مطالعہ کا میدان زیادہ تر طبیعی اعمال تک محدود تھا۔ اس لئے حیات، ذہن اور شعور کے متعلق انسانی معلومات بہت معمولی تھیں مگر انیسویں صدی میں فطرت کے کیمیادی اعمال کے مطالعہ کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ مادہ اور اُس کی قوتوں کے ساتھ حیات اور شعور کے رشتہ کے متعلق عمیق معلومات مہیا ہونے لگیں۔ عمرانی سائنسوں کی تدوین عمل میں آنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے بیسویں صدی کے وسط اوّل تک حیات، ذہن، شعور اور معاشرتی وجود کے متعلق بیش بہا معلومات کا ایک دریائے بیکراں وجود میں آگیا۔ اس عہد میں سرچارلس ڈارون کی نزولِ آدم، برگساں کی تخلیقی ارتقا۔ آئین سٹائن کا نظریۂ اضافیت، ہیگل کی جدلیات اور آخر میں کارل مارکس کے داس کیپٹال نے انسانی فکر وعمل کے ہر شعبہ میں انقلابی تبدیلیوں سے اُس کی کایا پلٹ کر دی۔

مگر برصغیر میں برطانوی غلامی کی وجہ سے اِن معلومات کو اتنی سُرعت کے ساتھ درآمد نہ ہونے دیا گیا، جتنی تیزی سے یہ مدوّن ہو رہی تھیں، مغربی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے اذہان چند نفوس تک محدود تھے۔ اس لئے سرسیّد کے عہد کی طبیعیاتی علوم کی پروردہ عقلیت کا سکہ رائج رہا، جس میں نئی اقدار کی تخلیق کو نمایاں جگہ نہیں ملتی۔ کیوں کہ طبیعیات کا موضوع مادہ اور اُس کی قوتوں کی اشکال کی تبدیلیوں تک محدود ہوتا ہے۔ یہ صرف کیمیا کا اشتلافی منہاج ہے جو وجود کے نئے مظاہر اور نئی اقدار کو دریافت کرتا اور اُنہیں تخلیق بھی کرتا ہے۔

اس عقلیت نے ایک طرف تو تقلیدی مذہبی نظام کے ساتھ سائنس کی مدافعت میں ایک کامیاب علمی جنگ لڑی۔ مگر دوسری طرف اپنی بنیادی ناپختگی کی وجہ سے ایک غلط علمی تحریک کو جنم دینے کا باعث بنی۔ اس تحریک کے تحت جدید علوم سے متعارف اور مذہبی ذوق رکھنے والے تعلیم یافتہ ذہنوں نے ہر علمی نظریہ اور سائنسی انکشاف کو قرآنِ حکیم کی آیات سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بیسویں صدی کے وسط اوّل میں علامہ اقبال ؒ کی فکری کاوشوں نے اس تحریک پر ایک بھرپور ضرب لگائی۔ اقبال ؒ نے کائنات کے حرکی تصوّر کو واضح کیا۔ فطرت میں نئی اقدار کی مسلسل تخلیق کے نظریہ کو ترویج دی۔ وسط ایشیا کے عمرانی تجربہ کو اپنے فکری نظام میں ایک مثبت نظریۂ حیات کی حیثیت سے جگہ دی۔ سب سے بڑھ کر اپنے خطبات میں علم بالحواس اور مذہبی مشاھدات کے درمیان حائل شدہ خلیج کو پاٹنے کی سعی کی۔

علامہ اقبال کے بعد وسط ایشیا، کے بلیغ عمرانی تجربہ سے متعلق ادب برصغیر میں کثرت سے آنے لگا۔ اور اس ادب نے ہیگل کی جدلیات کی فکری اور تنقیدی صلاحیتوں کو تحقیق کی مابعد الطبیعی منہاج کے مقابلہ میں واضح کیا۔ اس وضاحت نے ذہن کو ایک ایسے نظریۂ علم سے مسلح کر دیا جس کی مدد سے فکر و نظر کے تمام میدانوں میں مابعد الطبیعیات کی کم نظری سے پھیلی ہوئی ثنویت کو ختم کرنے کا تاریخ میں پہلی بار مثبت امکان پیدا ہوا۔

جدلیات نے بتایا کہ اوّل و آخر اور ظاہر و باطن ایک ہی حقیقت موجود ہے۔ اسے اوّل و آخر یا ظاہر و باطن کے ثنوی خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی ذہن جب بھی تجربہ سے دوچار ہوتا ہے، حقیقت اپنے کسی نہ کسی پہلو کو اُس پر منکشف کر دیتی ہے۔ ہیگل کا یہ مقولہ کہ "حقیقت ہی صداقت ہے اور صداقت ہی حقیقت ہے" اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے وجود اور اس کے مظاہر ہی حقیقت اور صداقت ہیں۔ حقیقت اِن سے ماوراء نہیں رہتی۔

حقیقت کا تصوّر اور علمِ الٰہی

یہ بات کہ ہم اپنی تحقیقی کاوش میں حقیقت کی سطح سے عُمق کی طرف جاتے ہیں، مگر سطح سے عمق کی طرف جاتے ہوئے جو کچھ ملتا ہے، وہ حقیقت اور صداقت ہے اور اس ساری حقیقت یا صداقت کا علم، انسان کا اپنی خواہش اور ارادہ سے تخلیق کردہ علم نہیں ہے، جس میں اُس کے ذاتی قیاسات کو دخل حاصل ہو، بلکہ اِس سارے علم میں حقیقت بذاتِ خود جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور یہ علم، انسانی ذہن کی آزاد تخلیق نہیں بلکہ حقیقت کے کسی نہ کسی رُخ کا انکشاف ہے۔ چونکہ یہ حقیقت انسان کی اپنی تخلیق کردہ نہیں بلکہ اُس کے اپنے وجود سے بھی پہلے موجود تھی۔ اور یہ حقیقت ذاتِ مطلق کے مظاہر کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا اس حقیقت کے متعلق تمام علمی انکشافات علمِ الٰہی کا حصہ ہیں۔ کیوں کہ حقیقت کے تمام مظاہر کے متعلق ذاتِ باری تعالیٰ تفصیلی علم کی حامل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے تحقیقی عمل کے دَوران غیر حقیقی التباسات بھی جگہ پا لیتے ہیں۔ مگر سائنسی پراسس "اپنے معلوم کردہ حقائق کو جب تجربہ اور بار بار تجربہ کی بھٹی سے گزارتا ہے، اور اپنے معمل میں منکشف شدہ حقائق کو خارجی طور پر دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہو جاتا ہے تو تمام غیر حقیقی قیاسات اور التباسات سے وہ سائنسی 'معلوم' پاک و صاف ہو جاتا ہے اور اُس خالص حقیقی علم

کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو پہلے سے ذہنِ الٰہی میں موجود تھا۔

یہ حق تعالےٰ ہی ہے جس نے انسان کی فطرت میں ملائکہ کے مقابلہ میں فطرت اور سماج کے علوم کو منکشف کرنے کی صلاحیت ودیعت فرما دی اور انسانی ذہن کے سائنسی کیریکٹر نے اس ودیعت شدہ فطری قابلیت کو عملاً ثابت کر دیا۔ لہٰذا فطرت، معاشرتی تنظیم کی تمام بنیادی شکلوں اور شعور انسانی اور اُن میں کام کرنے والے قوانین کو انسان نے تخلیق نہیں کیا۔ اور ان قوانین کا انکشاف دراصل حقیقت کے کسی پہلو کے متعلق 'علم' کا حصول ہے اور یہ علم حقیقت کا علم ہے۔ کسی اور چیز کا نہیں۔

قرآنِ حکیم کی رُو سے ذاتِ باری تعالےٰ اپنے داخلی ممکنات کا اظہار انفس و آفاق دونوں ذریعوں سے کر رہی ہے۔ اس لئے انفس و آفاق کے کسی گوشے کا علم بھی دراصل علم الٰہی ہے۔ کیوں کہ انفس و آفاق کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی آیات، اللہ کی آیات ہیں۔ انہیں اللہ نے تخلیق کیا ہے، مگر انسان ان آیاتِ الٰہی کے ما فیہ کو تحقیق کے استقرائی منہاج کی مدد سے صرف منکشف کرتا ہے۔

اُصول استقراء کے ذریعہ حاصل کردہ علم، حق تعالیٰ کی آیات کے متعلق صحیح معلومات مہیا کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ اُصولِ تحقیق قلم یعنی ریکارڈ سے مدد لیتا ہے۔ اور ریکارڈ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی خواہشات اور قومی میلانات سے الگ ہو کر اشیاء کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ طریقِ تحقیق بہت محنت طلب اور تدریجی ہوتا ہے۔ اس میں فطرت، معاشرہ یا نفسِ انسانی کے کسی ایک مظہر کے متعلق برسوں کی محنتِ شاقہ کے بعد نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اور ان نتائج کی صحت کو جانچنے کے لیے اُنہیں پھر تجربہ کی محک پر پرکھا جاتا ہے تاکہ اُس مظہر کا مشاہدہ و مطالعہ کرتے وقت اگر انسانی قیاس اور ذہنی التباس کو کچھ دخل حاصل ہو گیا ہو تو تجربہ اور بار بار تجربہ کی بھٹی میں وہ قیاسی اور التباسی عنصر خارج ہو کر خالص فطری علم باقی رہ جائے۔

اُصولِ استقراء کے مقابلہ میں اُصولِ استخراج سے حاصل کردہ علم کی بنیاد انسانی قیاس پر ہوتی ہے۔ چونکہ انسانی قیاس کے ذریعہ استنباط کردہ علم خارجی حقیقت سے تطابق نہیں رکھتا۔ اس لئے اُسے علمِ الٰہی کا جزو قرار نہیں دیا جا سکتا۔

فطرت کے مظاہر کے متعلق انسانی قیاس کی بنیاد تدریجی، تجزیاتی اور تجرباتی تحقیق پر مبنی نہیں

ہوتی۔ بلکہ یہ عالمگیر اُصول وضع کر کے اُن سے نتائج استنباط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتائج یا معلومات کے اس طرح استنباط سے انسان کے ذاتی میلانات اور خواہشات کو اُس کے فکری پراسس میں کافی مداخلت کا موقع مل جاتا ہے اور اس منہاجِ فکر سے تدوین شدہ علم اپنے عہد کے عمرانی اور نظریاتی تعصبات سے شدید طور پر متاثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی مدلولات کی بِنا پر جب فلسفی اپنے تصورِ کائنات وحیات کو مرتب کرتا ہے تو اس کی تعمیر میں فلسفی کے ذاتی قیاسات اور تعصبات اور اُس عہد کے مخصوص معاشرتی نظام کے اقتضاآت نمایاں طور پر حصہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ اور ادب اگرچہ سائنس کی جزو پسندی کے مقابلہ میں حقیقت کی کلّی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اپنے فکری کردار میں جانب دار اور غیر تجربی ہونے کی وجہ سے اُن کے تصورِ حیات و فطرت کو علم الٰہی کا جزو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس وہ سائنسی حقائق، جن کی بِنا پر وہ اپنے تصورِ کائنات کو ترتیب دیتے ہیں، علمِ الٰہی کا جزو ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کی تحقیق میں فرد کے ذاتی قیاس اور اُس کے مخصوص عہد کے تقاضوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

یہ بات کہ فطری یا طبعی سائنس کے مقابلہ میں عمرانی سائنسوں میں انسان کے ذاتی رجحانات و میلانات کو زیادہ دخل حاصل ہوتا ہے، اس لئے عمرانی سائنس کا پیش کردہ علم انسانی قیاسات و خیالات پر مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا اُسے خالص فطرت یا حقیقت کا علم نہیں کہا جا سکتا۔ اس اعتراض میں کسی حد تک صداقت کا جزو موجود ہے۔ مگر اُسے جس رنگ میں پیش کیا جاتا ہے، وہ قطعاً غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ حیات میں طبقاتی مفاد نے عمرانی سائنسوں کی نمو پذیری کو سخت نقصان پہنچایا۔ کیوں کہ معاشرتی اعمال، تصورات اور تاریخ کی غیر جانب دار یا سائنسی تحقیق، ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے مالک طبقات کے مفاد کے خلاف جاتی تھی۔ اس لئے استحصال پسند طبقہ نے جہاں فطری سائنس کو نمو پذیر ہونے کا موقع دیا۔ وہاں عمرانی سائنس کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ لیکن وسط ایشیا کے عمرانی تجربہ کی وجہ سے مفاد پرست طبقات کو جب ختم کر دیا گیا تو عمرانی سائنسوں نے تیزی کے ساتھ ترقی کی اور فطری سائنس کی طرح عمرانی اعمال کی تحقیق قطعاً غیر جانب دار اور بے لوث بنیادوں پر کی جانے لگی۔

حصولِ علم کا سائنٹیفک پراسس | علم حاصل کرنے کے سائنٹیفک پراسس میں انسان

اشیاء کے ساتھ فعّال تعلقات قائم کرتا ہے۔ یہ فعال تعلق مجہول مشاہدہ سے فعال مشاہدہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ مجہول مشاہدہ سے، جو حسّی ادراک کی منزل ہے، حاصل کردہ ادراکات و احساسات کے مدلولات کو سطحی تصدیقات یا قضایا کی شکل میں مرتب کیا جاتا ہے اور فعال مشاہدہ کے نتائج کو عمیق تصدیقات میں مدوّن کیا جاتا ہے۔ یہ تصدیقات اشیاء سے مزید فعّال تعلق قائم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

اس طرح ہم سطحی تصدیقات سے عمیق تصدیقات کی طرف جاتے ہیں یعنی مشاہدہ کے معمولی نتائج کو بیان کرنے والی تصدیقات سے اشیاء کی ترکیب، ان کی اندرونی تنظیم، اُن کے علل و معلول، تفاعل، ہم ربطی اور حرکت کے قوانین کا اظہار کرنے والی تصدیقات تک جاتے ہیں۔

یہ عمل تصدیقات کے سطحی مافیہ سے عمیق مواد تک ایک کیفیتی تغیر ہوتا ہے۔ سطحی تصدیقات اشیاء کے مختلف پہلوؤں کا اظہار کرتی ہیں اور اشیاء کے درمیان خارجی تعلقات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسی مرحلہ میں ہم محض قیاس اور التباس تک رہتے ہیں۔ لیکن عمیق تصدیقات یا قضایا کی تدوین تصدیقات کی چھان بین کرنے، اُن کا باہمی تقابل کرنے، تعمیم کرنے اور تجریدی تصورات کی تشکیل کرنے اور تعمیم و تجرید سے استدلال اور نتائج اخذ کرنے سے وجود میں آتی ہیں۔ یہ مرحلہ خلاصہ یا اشیاء کی کلّیت اور اُن کے داخلی تعلقات بیان کرنے کا مرحلہ ہوتا ہے۔

اس طرح ہم علم کے ادراکی مرحلہ سے جو اشیاء کے متعلق ابتدائی تصورات، سطحی علم، اُن کے ظواہر کے علم اور اُن کے مختلف پہلوؤں کے علم کا درجہ ہوتا ہے، عقلی مرحلہ تک پہنچتے ہیں، جو اشیاء کے تجریدی تصورات، اُن کے عمیق علم، اُن کے خلاصہ یا کُل کے علم کا درجہ ہوتا ہے۔ یعنی اشیاء کے عقلی درجہ میں ہم اشیاء کے خارجی تعلقات سے اندرونی خواص، اُن کے خاصوں کے باہمی تعلقات تک پہنچتے ہیں۔ دراصل علم کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ سطحی ظواہر سے اُن کے پیچھے جو پوشیدہ روابط اور قوانین ہیں، ان کا تفصیل و تجزیہ کے ذریعہ پتہ لگائے اور اس طرح ظواہر کو کامل طور پر سمجھنے میں مدد دے۔

جب ہم ادراکی علم سے عقلی علم تک پہنچتے ہیں تو عقلی علم میں ایک نئی قدر ظہور کرتی ہے جس سے ہم عقلی علم سے انقلابی علم تک پہنچ جاتے ہیں۔ انقلابی علم کے مرحلہ پر ہم اشیاء اور اُن کے نظام کو عمیق طور پر سمجھنے کے بعد اُن میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ مرحلہ محض تفہیم کا نہیں بلکہ

تسخیر کا ہوتا ہے۔

علم حاصل کرنے کے اس سائنٹی فک پراسس کی ایک مثال کے ذریعہ زیادہ وضاحت کی جا سکتی ہے۔ سیب کے ساتھ جب انسانی ذہن تعلق قائم کرتا ہے تو سب سے پہلے اُسے سیب کا مجہول مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ سے ذہن اُس کی خوشبو، ذائقہ، رنگ، سطح کی ملائمت اور اُس کے حجم سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ یہ ادراکی علم کا مرحلہ ہے، جو سیب کے متعلق سطحی علم، اُس کے ظاہر کے علم کا درجہ ہے۔ اور ذہن اس ادراکی پراسس کو جن تصدیقات میں بیان کرتا ہے، وہ تصدیقات بھی سطحی ہوتی ہیں۔ جیسے سیب خوشبودار ہے۔ سیب کا رنگ سُرخ و زرد ہے۔ سیب کا لمس ملائم اور نرم ہے وغیرہ۔ مگر جب سیب کو معمل میں لے جاکر اُس کے اجزاءِ ترکیبی کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اُس میں پانی گلوکوز، حیاتین اور مختلف معدنی عناصر کی مقدار کو معلوم کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ ہی جب سیب اور اُس کے درخت کے تعلق کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور سیب، درخت اور فطرت کے باہمی تعلق کی نوعیت کے متعلق بھی معلومات حاصل کی جاتی ہیں تو سیب کے متعلق مکمل علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اور یہ علم کا عقلی مرحلہ ہے۔

اس مرحلہ میں سیب کے اندرونی خواص، اُن کے خاصوں کے باہمی تعلقات، سیب کے عناصر کی ترکیب، اُن کے باہمی تفاعل، اُس کی تخلیق کے علل و اسباب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور اس مطالعہ کو جن تصدیقات میں لکھا جاتا ہے، وہ عمیق تصدیقات ہوتی ہیں۔

ان عمیق تصدیقات میں بیان شدہ حقائق کو جب تعمیموں میں مدوّن کیا جاتا ہے، تو یہ پراسس سیب کی تفہیم سے اُس کی تسخیر میں بدل جاتا ہے۔ اب انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ سیب کے قوانینِ تخلیق میں تصرف کر کے نہ صرف سیب کی مختلف انواع کو پیدا کرے، جو فطرت میں پہلے موجود نہیں تھیں۔ بلکہ دوسرے پھلوں کے ساتھ اُس کا پیوند لگا کر فطرت کو اُس کے تخلیقی عمل میں مدد بھی دے اور تخلیق میں اضافہ بھی کرے۔ اس مرحلہ تک رسائی حاصل کرنے سے انسان اُس بلند مقام پر فائز ہو جاتا ہے، جیسے اقبالؒ نے یہ کہہ کر واضح کیا تھا کہ "انسان تخلیق میں خدا کا ہمسر ہے"۔

علم کے اس سائنٹی فک پراسس سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہ "اشیاء جیسی کہ وہ ہیں" پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور یہ سائنٹی فک پراسس خود انسانی جذبات و خواہشات سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہ

غیر جانب دار اور بے لوث ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس پراسس سے معلوم شدہ حقائق کسی معاشرتی طبقہ کے مفاد سے تعلق نہیں رکھتے۔ فطرت ہر جگہ لا طبقاتی، غیر جانب دار اور بے لوث ہوتی ہے۔ چوں کہ اس سائنٹی فک پراسس سے حاصل کردہ علم حق تعالےٰ کی تخلیق کا علم ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ علمِ الٰہی کا حصہ ہوتا ہے۔

معاشرتی سائنس کی نارسائی

مگر طبیعی سائنس کے بعد جب معاشرتی سائنس کی تدوین کا مرحلہ آیا، اور اِن معاشرتی سائنسوں نے حصولِ علم کے سائنٹی فک پراسس سے کام لے کر مختلف عمرانی اداروں کے فطری ارتقاء اور اُن کی معاشرتی غایت پر روشنی ڈالی اور اُن سے نتائج اخذ کئے، تو اس سے معلوم ہوا کہ انسانی سماج، اُس میں کام کرنے والے قوانین اور قوتیں طبیعی فطرت کا حصہ ہیں۔ اس سے جُدا یا علیحدہ نہیں ہیں۔ اور اِن معاشرتی اداروں میں کام کرنے والے قوانین کا عمل بھی طبیعی فطرت کی طرح غیر جانب دار اور بے لوث ہوتا ہے، جسے معاشرتی زبان میں عوامی یا لا طبقاتی کہا جا سکتا ہے۔ لامحالہ معاشرتی اعمال کے اس سائنٹی فک علم سے ایک طبقاتی معاشرہ میں اُس کے تمام طبقے متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہ تاثر جہاں ذرائع پیداوار پر قابض طبقوں کے استحصالی مفاد کے خلاف جاتا ہے، وہاں محنت کش عوام کے حق میں نتائج مرتب کرتا ہے۔ اس لئے کہ سائنٹی فک حقائق کا کیریکٹر غیر جانب دار اور بے لوث ہوتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ استحصال پسند طبقہ نے جہاں طبیعی سائنس کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا، کیونکہ اس سے اُن کے منافع کی مقدار میں اضافہ ہوتا تھا۔ وہاں عمرانی سائنس کا گلا دبا دیا۔ کیوں کہ علم کے سائنٹی فک پراسس کا جب عمرانی اداروں پر اطلاق کیا گیا اور اُس سے جو نتائج مرتب ہوتے وہ اس طبقہ کے مفاد کے خلاف جاتے تھے۔ مگر اس طبقہ نے معاشرہ کے متعلق خام اور سطحی مدلولات کو اُس کے مکمل سائنٹی فک علم کی جگہ ترویج دیا اور غیر جانب دار تفحص و تلاش کرنے والے محققوں کی جگہ انعام حاصل کرنے والے سکالروں کو ترجیح دی۔

معاشرتی عمل کے سائنس کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ عمرانی مسائل اپنے غیر جانب دار، بے لوث اور طبقاتی مفاد سے پاک حل سے محروم ہو گئے، جو سائنسی کیریکٹر کا امتیازی وصف تھا۔

وحی الٰہی اور سائنسی علم

سائنس کی روشنی سے محروم ہونے کے بعد، معاشرتی مسائل کے بے لوث، غیر جانب دار اور لا طبقاتی حل حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل کردہ ہدایات تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ وحی الٰہی تمام طبقاتی اور قومی مفادات سے بالا ہونے کی وجہ سے سائنٹفک حل دے سکتی تھی، مگر ایک مخصوص طبقہ نے، جو معاشرتی طبقات کو فطری تسلیم کرتا ہے، وحی الٰہی کی تشریح و تفسیر اس طرح کی ہے کہ وہ اپنی نوعیت میں غیر جانب دار، لا طبقاتی اور بے لوث ہونے کے باوجود، طبقاتی مفاد اور جانبداریت کی نمائندہ بن چکی ہے۔ وحی الٰہی کی تفسیر و تشریح کے لئے کسی مخصوص معیار کے فقدان سے ہر وہ شخص، جو آیاتِ الٰہی کی من مانی تاویل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، مفسر و مجتہد کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

آج تمام مذاہب میں صرف اسلام کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ اُس کی بنیادی الہامی کتاب کا متن محفوظ ہے، مگر اس متن کی ایک تشریح یا تفسیر بھی موجود نہیں جو اُس کے تمام بنیادی مقاصد کو ہمارے سامنے غیر جانب دار، بے لوث اور لا طبقاتی حیثیت سے پیش کرتی ہو۔ قرآن حکیم کو اُس کے اپنے نقطۂ نظر سے مطالعہ نہیں کیا جاتا، بلکہ صاحبِ تفسیر اپنے ذاتی نقطۂ نظر سے اُسے دیکھتا ہے۔ اور یہ عیاں ہے کہ طبقاتی سماج میں طبقاتی اندازِ نظر کا حامل ذہن غیر جانب دار ہو بھی کیسے سکتا ہے۔

سائنس اپنے تدریجی، تجزیاتی اور تجرباتی عمل کے ذریعہ شئے مشہود کے ایک ایک پہلو کو عریاں کرتی چلی جا رہی ہے تاکہ وہ شئے بذاتِ خود تک پہنچ سکے اور یہ پراسس شاید لامتناہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سائنس کے حاصلات کو ظن و تخمین کہا جاتا ہے۔

سائنس اپنے تجزیاتی، تدریجی اور تجرباتی پراسس سے شئے کے ایک رُخ سے نقاب اُلٹنے کے بعد جب دوسرے رُخ کو عریاں کرتی ہے تو پہلے رُخ کے احکامات و قوانین، اُس کے دوسرے رُخ کے احکامات و قوانین سے مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ پہلے رُخ سے دوسرے رُخ کا علم زیادہ عمیق اور جامع ہوتا ہے۔ اس طرح سائنس شئے کے عمیق سے عمیق تر پہلوؤں کے متعلق بتدریج ہمارے سامنے 'علم' کو ظاہر کرتی چلی جاتی ہے۔

شئے بذاتِ خود اپنے ظہور کے لئے کئی دوائر سے اس لئے گزرتی ہے، کہ وہ تغیر و حرکت کے

مسلسل میلان میں گھری ہوتی ہے، یعنی شئے بذاتِ خود اپنے داخلی دباؤ سے اپنی امکانی قوتوں کے ظہور پر مجبور ہے۔ اس لئے اس ظہور پذیری کے عمل سے وہ دائمی تغیر و حرکت کی حالت میں رہتی ہے اور یہ پراسس فطری و سماجی دونوں دائروں میں جاری رہتا ہے۔ اس طرح عقلِ انسانی وجود اور اس کے مظاہر کے مبداء و معاد تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ کیوں کہ عقل استقرائی شئے کے تہہ در تہہ ظہورات کے مطالعہ میں ہی مصروف رہتی ہے۔

اس مرحلہ پر انسان کو وحی الٰہی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ وہ تخلیق کے اس سارے عظیم سلسلہ کے مبداء و معاد کے متعلق علم حاصل کر سکے اور اپنے سائنٹی فک پراسس کے حاصلات کو غایتِ حیات کے ماتحت منظم کر سکے اور اُن سے حاصل شدہ علم کو اپنی تخلیقی غایت کی تکمیل کے لئے عمل میں لا سکے۔

سائنسی شعور اور شعورِ نبوت

سائنس دان کا شعور جہاں ذہنی وجدان سے استقرائی مشاہدہ و تجزیہ کی طرف جاتا ہے، وہاں شعورِ نبوت استقرائی مشاہدہ و تجزیہ سے عقلی وجدان کی طرف آتا ہے۔ یعنی اپنے استقرائی مطالعہ کو وحی الٰہی کی مدد سے وجدانی زبان میں بیان کرتا ہے۔

عقل کا استقرائی اور استخراجی منہاج تحصیلِ علم کے لئے جس طرح عالمگیر ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح قرآنِ حکیم وحی الٰہی کو بھی حصولِ علم کا ایک عالمگیر ذریعہ قرار دیتا ہے۔ جو نبی اور غیر نبی (اُمّ موسٰے)، نامیہ (نحل) اور غیر نامیہ (ارض) سب سے تعلق رکھتا ہے۔ شعورِ نبوت اپنے استقرائی مطالعہ کے نتائج [illegible] وجدانی زبان میں بیان کرتا ہے جب کہ عقلِ انسانی اپنی معلومات کو استدلالی زبان میں ظاہر کرتی ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس اگر وجود اور اس کے مظاہر کے مرحلہ بمرحلہ تفصیلی و تجزیاتی علم کا ذریعہ ہے تو شعورِ نبوت ان کے مبداء و معاد اور اُن کی تخلیقی غایت کا علم ہے۔

جس طرح وجود اور اُس کے مظاہر کے مبداء و معاد، اُن کی غایت اور اس غایت کے معاشرتی مسائل پر اطلاق سے جو حل معلوم ہوتے اور نتائج اخذ ہوتے ہیں جنہیں شعورِ نبوت وحی الٰہی کے عالمگیر قانون کے ماتحت معلوم کرتا ہے، علم الٰہی کا حصہ ہیں۔ اسی طرح وجود اور اُس کے مظاہر کا

تجزیاتی اور تجرباتی علم بھی علم الٰہی ہے، جسے سائنس دان کا شعور، تعقل و استدلال کے قانون کے ماتحت معلوم کرتا ہے۔

ذہنِ انسانی کسی شئے کا وقوف حاصل کرتے وقت اپنے مطالعہ و مشاہدہ سے حاصل کردہ مواد میں زمان و مکان کی مقدار جمع کرتا اور اُسے مقولات کے سانچوں میں ڈھالتا ہے، کیوں کہ اس عمل کے بغیر وہ شئے، کا وقوف اور ادراک حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ذہنِ نبوت جب وجود مطلق کے ساتھ تعلق و ربط قائم کرتا ہے تو وہ جس درجہ میں ذاتِ الٰہی اور اُس کی صفات کو ادراک کرتا ہے، اپنے مطالعہ و مشاہدہ سے حاصل کردہ مواد میں ذات و صفات کی ادراک کردہ مقدار کو جمع کر دیتا ہے۔ اس عمل سے شعورِ نبوت مظاہر وجود کے مبداء و معاد اور ان کی غایتِ تخلیق کو معلوم کرتا ہے۔ جس طرح عام انسانی شعور اپنے ذہنی پراسس کو شعوری طور پر بالارادہ عمل میں لاتا ہے۔ ذہنِ نبوت کے اس وجدانی پراسس میں شعوری ارادہ کو دخل حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص اپنی محنت و سعی سے نبی نہیں بن سکتا بلکہ یہ ایک وہبی عمل ہے جس کے ذریعہ نبی بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے۔ صوفی جب ذاتِ باری تعالیٰ سے ربط و تعلق قائم کرتا ہے تو اُس کا مقصد محض رؤیت ذات تک محدود ہوتا ہے۔ وہ ذات اور اُس کی صفات کے حوالی سے مظاہر حیات و فطرت کے علم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے صوفی بنتا ہے۔ پیدا نہیں ہوتا۔

مذہبی تقلیدی نظام نے اِن دونوں علوم میں سے سائنسی علم کو انسانی علم اور شعورِ نبوت کے حاصلات کو علمِ الٰہی قرار دے کر انسانی ارتقاء کے عمل میں ایک ناقابلِ حل رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ (مسلسل)